بیادِ رفعت سروش

ڈاکٹر شبانہ نذیر

A-103، سیوی ٹیک سمپریتی، سیکٹر 77، نوئیڈا۔201301، موبائل: 9650330332

رفعت سروش منفرد ادیب، شاعر، ڈراما نگار، انشاپرداز، نثر نگار اور براڈ کاسٹر ۲؍جنوری ۱۹۲۶ء کو اتر پردیش کے مردم خیز علاقہ نگینہ، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے، ان کا اصل نام سیّد شوکت علی تھا۔ان کے والد کا نام سیّد علی اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ ہے۔ان کے دادا سیّد علی کا شمار نگینہ کے کھرے سیّدوں میں ہوتا تھا۔

رفعت سروش کی ابتدائی تعلیم نگینہ کے مکتب میں ہوئی۔تیسری جماعت تک نگینہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ موانہ، ضلع میرٹھ چلے گئے۔ ۱۹۳۵ء میں میٹرک اور ۱۹۴۹ء میں بمبئی سے ہندی وِدّیاپیٹھ کا بھاشا رتن امتحان پاس کیا جو بی۔اے کے مساوی ہے۔

رفعت سروش بہت ذہین تھے اور اسی لئے انھیں بچپن سے ہی وظیفے ملنے لگے تھے، جس کے سبب بغیر کسی دشواری کے تعلیم جاری رہی۔ان کی ذہنی تربیت میں ان کے بڑے بھائی سیّد ممتاز علی کا بڑا تعاون رہا۔ان کی سرپرستی میں رفعت سروش نے خوش خطی سیکھی، نثر و نظم کو پڑھنا اور سمجھنا اور بامحاورہ اردو لکھنا سیکھا۔بچپن میں مسجد کے صحن میں وقت گزارنا ان کو بے حد پسند تھا۔وہ اس پاکیزہ ماحول سے بہت متاثر ہوتے تھے۔گل بوٹے بنانا، مسجد کے میناروں کے لیے نئے نئے نقشے بنانا رفعت سروش کا محبوب مشغلہ تھا۔

سیّد ممتاز علی کے علاوہ ان کے دوسرے بڑے بھائی سیّد اشتیاق علی کی صحبت بھی ان پر اثر انداز ہوئی۔سیّد اشتیاق علی شوق اور ان کے دوست اختر عباس نخشب جار چوی کو شعر گوئی کا شوق تھا۔یہ لوگ ایک دوسرے کو شعر سناتے۔داد و تحسین کا ماحول بنا اور انہی کی دیکھا دیکھی رفعت سروش نے بھی شعر کہنا شروع کر دیا۔

اپنی اسکولی تعلیم کے بارے میں رفعت سروش نے لکھا ہے:

''ایم بی اسکول صرف چھٹی کلاس تک منظور شدہ تھا اور چونکہ مجھے یو پی بورڈ سے وظیفہ ملتا تھا اس لیے منظور شدہ اسکول میں ہی پڑھنا لازمی تھا۔چنانچہ میں نے جی ایچ بی ہاؤس میں داخلہ لیا۔اسکول کے ہیڈ ماسٹر گووند سنگھ میرے گزشتہ تعلیمی ریکارڈ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔''

اسی اسکول کی تعلیم کے دوران دو باتیں پیش آئیں۔ایک بار آپ کے ٹیچر جوہری صاحب نے ایک سوال کلاس میں کئی لڑکوں سے پوچھا۔ جواب نہیں ملا تو انھوں نے رفعت سروش کی طرف رخ کر کے کہا: ''تم ہی بتاؤ Poet of the class- یہ جملہ رفعت صاحب کو نئی زندگی بخش گیا۔ دوسرا واقعہ خود ان کی زبانی سنیے:

''ایک دفعہ ایک ڈپٹی کلکٹر ہمارے اسکول میں معائنہ کرنے آئے۔انھوں نے تقریر کی کہ ہر طالب علم کے ذہن میں ایک مقصد ہونا چاہیے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے۔پھر طلبا سے سوال کیا۔ اکثر لڑکے خاموش رہے اور بولتے بھی کیا، ہمارا طریقِ تعلیم تھا ہی کیا۔بقول اکبر آبادی 'کھاڈبل روٹی' کلرکی کر' خوشی سے پھول جا'۔جب یہ سوال مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے بے ارادہ اور بے ساختہ کہا کہ میں ایک بڑا شاعر بننا چاہتا ہوں۔''

خدا کی کرنی دیکھیے کہ ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی اور وہ بڑے شاعر بن گئے۔

نگینہ کے شوکت علی اور موانہ سے واپس آئے شوکت علی میں بڑا فرق تھا۔وہ دبا دبا، سہا سہا محروم سا لڑکا اب کینچلی بدل چکا تھا۔

سر پر باریک مشین نہیں پھرتی تھی بلکہ گھونگھریالے انگریزی بال رکھ لیے تھے۔صاف اور نفیس لباس پہننے لگے تھے۔ٹوپی پہننا گوارا نہیں تھا مگر ابّا کی نافرمانی بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔اس لیے ٹوپی کتابوں کے بیچ میں رکھ لی جاتی تھی۔گھر قریب آتے ہی ٹوپی سر پر رکھ لیتے تھے۔کبھی کیرم کی بازی لگتی تو کبھی شعر و شاعری کی محفل سجتی۔میٹرک کے دوران سیّد شوکت علی نے جدید طرز پر نظمیں لکھنی شروع کر دیں اور یہ نظمیں 'ہمایوں' اور 'شاہکار' جیسے رسائل میں چھپنے لگیں، مگر سیّد شوکت علی کو اپنے نام سے قدامت کی بو محسوس ہوئی اور یوسف ظفر اور قیوم نظر کی طرز پر دو لفظی نام اختیار کر لیا 'رفعت سروش'۔اس نام سے جو پہلی نظم چھپی وہ تھی 'گلاب کا پھول'۔

یوسف ظفر نے جب نظم چھاپی تو سمجھے کسی عمر رسیدہ شاعر کا کلام ہے۔ کیوں کہ کلام پختہ تھا۔گلاب انسان کی زندگی کا سمبل اور نظم زندگی سے موت

تک کا سفر بیان کرتی ہوئی:

کِھلا ہوا ہے جھاڑیوں میں پھول اِک گلاب کا
اٹے ہوئے غبار میں ہیں جس کے عارض و جبیں
کچوکے دے رہے ہیں خار خنجروں سے پے بہ پے
لہولہان ہے تمام اس کا جسم نازنیں

اور نظم کا آخری بند ہے:

ہر ایک شے کو دیکھتا ہے یوں نگاہِ یاس سے
کہ جیسے دہر میں کوئی نہیں ہے اس کا ہمنوا
سہے ذرا سی جان اف یہ ظلم وجود تابہ کے
ہوا میں جھولتا ہوا وہ گر گیا، بکھر گیا
کِھلا ہوا تھا جھاڑیوں میں پھول اِک گلاب کا

درحقیقت رفعت سروش کا مزاج بچپن سے نہ تو شاعرانہ تھا اور نہ ہی عاشقانہ۔ ان کا مزاج تو مصوّرانہ تھا۔ انھیں ڈرائنگ کا بچپن سے شوق تھا۔ ابتدا تکیوں اور چادروں کے نقوش سے ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ شوق اتنا بڑھا کہ بغیر کوئی اسکیل بنائے صرف تصویر سامنے رکھ کر دو گنی، تین گنی تصویر بنا لیتے تھے۔ درجہ پانچ میں ہی تھے جب شہنشاہ شاہجہاں کی تصویر بنائی جس کی خوب تعریف ہوئی اور انعام بھی ملا، مگر جب بڑے بھائی سیّد امتیاز علی کو معلوم ہوا تو انھوں نے سختی سے منع کر دیا کہ جاندار چیزوں کی تصویریں بنانا گناہ ہے اور بس یہ خوف خدا ایسا دل پر چھایا کہ پھر مصوّری نہیں کی۔ کی تو صرف بیل بوٹوں کی حد تک۔ درحقیقت یہ خوف خدا ہی انسان کو انسان بنائے رکھتا ہے:

یاد خدا میں جی نہ لگا ہے یہ اور بات
خوفِ خدا تو دل میں رہا ہے تمام عمر

یہ خوف خدا بچپن سے ایسا دل میں سمایا کہ ہمیشہ نیک اور سچی زندگی گزاری اور الفاظ سے تصویر کشی کرتے رہے۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں آل انڈیا، ریڈیو بمبئی میں ملازمت کی۔ انتالیس سال ریڈیو سے وابستہ رہے۔ تیرہ سال بمبئی میں اور چھبیس سال دہلی میں۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۸۴ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آل انڈیا ریڈیو میں رفعت صاحب نے بڑی فعال زندگی گزاری۔ مختلف پروگراموں کے انچارج رہے۔ 'گجرا' 'گیتوں بھری کہانی' اور آخر میں 'اردو مجلس'۔ یہ آخری پروگرام ان کی پہچان بن گیا۔

ضیا فتح آبادی نے اپنے مضمون 'کردار کا غازی: رفعت سروش' میں لکھا ہے:

''اردو مجلس سے ایک آواز ہر روز دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو کر ہندوستان کے طول و عرض میں گونج جاتی ہے۔ اس آواز نے گزشتہ تیس برس سے اردو کے نام کو پھیلایا اور زندہ رکھا۔ یہ جانی پہچانی آواز اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر رفعت سروش کی ہے۔ دراصل رفعت سروش کا ہی دوسرا نام ہے 'اردو مجلس'۔

مجتبیٰ حسین نے 'ریڈیائی آدمی' میں لکھا ہے:

''رفعت سروش اور ریڈیو کا رشتہ استوار ہو چکا ہے کہ ریڈیو کو دیکھیں تو رفعت سروش کا اور رفعت سروش کو دیکھیں تو ریڈیو کا خیال آجاتا ہے۔ گویا رفعت سروش ریڈیو کے اندر ہیں اور ریڈیو خود رفعت سروش کے اندر ہے۔ من تو شدم تو من شدی''

یہ تو تھیں رفعت سروش کی منصبی ذمہ داریوں کی باتیں۔ اب رہا میدان شعر و ادب۔ ریڈیو اسٹیشن میں قدم جمانے کے بعد زندگی ڈھرّے پر آنے لگی تھی۔ پہلی فرصت میں انھوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ 'وادی گل' چھپوایا جو ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔ اور پھر اس کے بعد ۱۹۶۶ء میں 'ذکر اس پری وش کا' اور پھر تو یہ سلسلہ چل نکلا۔ کیا نظم، کیا غزل، کیا ڈراما، کیا بیلے، کیا اوپیرا۔ کیا کیا نہیں لکھا! کیا کیا نہیں چھپوایا!

'ہمارے رفعت سروش صاحب' میں نصرت ظہیر نے لکھا تھا:

''اردو ادب کا کوئی علاقہ اور کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں رفعت سروش نے کچھ نہ کچھ زمین نہ قبضا رکھی ہو۔ شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما، اوپیرا، تحقیق، تنقید۔ آپ ہی بتائیے اس کے بعد بھی ادب میں کوئی صنف سخن باقی رہ جاتی ہے۔ ہاں ایک صنف سخن ہے ادبی سیاست! جس میں رفعت صاحب نے زور آزمائی نہیں کی۔''

اس ادبی سیاست سے بے نیاز رفعت سروش اپنے قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ مصوّری کا وہ شوق جو بچپن سے دل میں سمایا ہوا تھا اب الفاظ کی صورت اختیار کرنے لگا تھا۔ مخمور سعیدی نے انھیں لفظوں کا صورت گر قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ رفعت سروش کی شاعری کا خاص وصف ہے لفظوں سے تصویریں بنانا۔

ملاحظہ ہو یہ نظم:

ایک چھپّر کا گھر، نیم کے سائے میں
اونگھتا ہے دھند لکے میں لپٹا ہوا
شام کا وقت ہے اور چولھا ہے سرد
صحن میں ایک بچّہ برہنہ بدن
باسی روٹی کا ٹکڑا لیے ہاتھ میں
سر کھجاتا ہے، جانے ہے کس سوچ میں
اور اسارے میں آٹے کی چکّی کے پاس
ایک عورت پریشان خاطر، اداس

اپنے رخ پر لیے زندگی کی تھکن
سوچتی ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد
آج بھی روکھی روٹی ملے گی ہمیں
تم حقارت سے کیوں دیکھتے ہو اسے
دوست یہ میرے بچپن کی تصویر ہے

اس نظم کی اثر انگیزی سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔

رفعت سروش نے زندگی کے ہر رنگ کا بھرپور مزہ لیا۔ محرومیاں ملیں تو خوشیاں بھی جھولی بھر بھر کر ملیں۔ خوشگوار ازدواجی زندگی پائی، سلیقہ شعار، ہنرمند اور مہمان نواز شریک حیات صبیحہ سروش ملیں۔ ان دونوں کی رفاقت مثالی تھی۔ ادبی حلقوں میں دونوں ایک ساتھ نظر آتے تھے۔ بچوں کی پرورش اور دیگر گھریلو ذمہ داریاں دونوں مل کر بخوبی نبھاتے رہے:

رقصاں ہیں نوید کی آنکھوں میں مستقبل کی روشن خاکے
جاوید، شبانہ، شاہینہ سب مل کر ہنستے ہوں جیسے

اور پھر وہ دن آیا کہ ۱۵؍دسمبر ۱۹۸۷ء کو صبیحہ سروش کا انتقال ہو گیا۔ رفعت صاحب تنہا ہو گئے۔ جب یہ تنہائی کا کرب ناقابل برداشت ہوتا چلا گیا تو پھر رفعت صاحب نے قلم اٹھایا اور الفاظ سے منظر کشی شروع کر دی اور وہ نظمیں غزلیں اور مرثیے رقم کئے کہ ہر آنکھ نم ہوگئی۔ ہر وہ دل جو کسی نہ کسی کی جدائی سہ رہا تھا تڑپ اٹھا۔

بقول ڈاکٹر شارب ردولوی: رفعت سروش اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے کسی ذاتی سانحے پر اتنی بڑی تعداد میں نظمیں اور غزلیں لکھی ہوں۔ اگر کبھی شخصی مرثیے کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو ان کا نام منفرد ہوگا۔ رفعت سروش کی شاعری کی بڑی خصوصیت پیکر تراشی یہاں نقطہ عروج پر نظر آتی ہے۔

نظم ملاحظہ فرمائیں:

'صبیحہ''

صباحتوں کا لطیف پیکر/نزول صبح بہار جیسے
نظر نظر تابناک منظر/گھنیری زلفوں کے ریشمی سائے
پرفسوں خوابناکی منظر/اداؤں میں شوخیوں کی بجلی
وہ زندگی کی سی بے قراری/شگفتہ لہجے کی سحر کاری
سماعتوں پر لطیف نغمے کا کیف طاری/وہ ایک عورت تھی
شوخ پیکر

غزل کے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

شہر شور و شر تنہا، گھر کے بام و در تنہا
تم نہیں تو لگتا ہے عالم بشر تنہا
شہر کے گلی کوچے پوچھتے ہیں رہ رہ کر
اے سروش پھرتے ہو کیوں اِدھر اُدھر تنہا

بقول پروفیسر قمر رئیس:

رفعت سروش کی بیشتر نظموں میں ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ الفاظ کا استعمال ایسی لطیف اشاریت کے ساتھ ایسی تہہ داری کے ساتھ کرتے ہیں کہ وہ ان کے باطنی اور داخلی جذبات کو ان کی ساری پیچیدگیوں کے ساتھ ان کی تہوں کو دوسروں تک پہنچانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کیا حسین شعر ہے:

نہیں ہے فن، لغت کے خوبصورت لفظ چن لینا
ہنرمندی تو ہے افکار تازہ کی حنا بندی

اگرچہ رفعت سروش ایک ترقی پسند فن کار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں اور ان کی شعری اور ادبی زندگی کا بڑا حصہ اسی نظریۂ زندگی سے وابستہ رہا ہے، لیکن انھوں نے کبھی غزل سے غزل کی روح کو جدا نہیں کیا۔ غزل کی چاشنی کو برقرار رکھا۔ کبھی اِسے سیاست اور نعرے بازی سے آلودہ نہیں کیا۔ شعر و ادب کی اعلیٰ و مثبت قدروں سے ان کا ذہنی رشتہ استوار رہا ہے۔ ان کے یہاں سادگی تو ہے، مگر اس درجہ سادگی نہیں جو شعر کو سپاٹ کر دے، اس کو بے مزہ کر دے، اس کے برعکس ان کے شعروں میں ہمیں منفرد قسم کی پرکاری اور دل آویزی ملتی ہے۔ ان کی غزلوں میں نغمگی ہے اور اکثر گلوکار جب ان کی غزلیں گاتے ہیں تو اس خوبی کا اعتراف کرتے ہیں۔

عام طور پر ترقی پسند شعرا کا امتیاز یہ رہا ہے کہ انھوں نے نرم اور مدھم سر میں بات کہنے کے بجائے اونچے سر میں راگ الاپا ہے، مگر ان کی غزل کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نرم، سبک، مدھم سر اور سرگوشیوں میں بات کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ذیل میں پیش کیے گئے اشعار ان کے اسی ہنر کی نشان دہی کرتے ہیں:

لکھ لکھ کے مٹا دیوے ہے تو نام یہ کس کا
سچ کہیو سروش آج کسے یاد کرے ہے
پھر خط کے انتظار کی لوٹوں گا لذتیں
پھر نامہ لکھ رہا ہوں تری بے رخی کے نام
نگاہ مل کے جھکی، جھک کے پھر اٹھی، لیکن
اس ایک لمحے میں صدیاں گزر گئیں جیسے
پھول رخسار کو، آنکھوں کو کنول ہی کہیے
اور جب کہیے بہ انداز غزل ہی کہیے

اوپیرا رفعت صاحب کا مخصوص میدان ہے۔

'شاہجہاں کا خواب' اردو کا وہ پہلا اوپیرا ہے جس نے ہر خاص و عام

سے داد و تحسین حاصل کی۔

اوپیرا 'شاہجہاں کا خواب' آگرہ کے ہوٹل کلارکس شیراز میں پانچ ماہ تک لگاتار پیش کیا گیا اور پھر دلّی کے تاریخی میلے 'پھول والوں کی سیر' میں بھی پیش کیا گیا۔

'شاہجہاں کا خواب' کا پہلا سین شاہجہاں کے دورِ اسیری کا ہے۔ وہ ایک مایوس اور مجبور انسان کی طرح تاج کو دیکھ رہا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ تاج کے پاس جائے مگر جا نہیں سکتا، آخر کار مایوس ہو کر کہہ اٹھتا ہے:

شاہجہاں:

جہاں آرا! کوئی صورت بتاؤں جلد مرنے کی
طلسم زندگی کے دشت و ایواں سے گزرنے کی

جہاں آرا اس کی عظمت یاد دلاتے ہوئے کہتی ہے:

جہاں آرا:

ہزاروں حکمراں دنیا میں یوں باکروفر گزرے
نہ باقی ہے فسانہ ان کی ہیبت اور رعونت کا
مگر وہ آپ ہیں جس نے دلوں پر حکمرانی کی
بنایا جاوداں اک نقش انساں کی محبت کا

جہاں آرا! نہ دہراؤ فسانہ عہد رفتہ کا
کہ اب اک گوشۂ زنداں ہے اور مجبور کی قسمت

الغرض 'شاہجہاں کا خواب' ایک کامیاب اوپیرا ہے۔ پیش کش اور تکنیک دونوں اعتبار سے۔

'جہاں آرا' رفعت سروش کا وہ اوپیرا ہے جس کی بنیاد جہاں آرا کی داستان محبت پر ہے۔ یہ بحث نہیں ہے کہ یہ محبت حقیقت ہے کہ افسانہ، مگر پیشکش بے حد حسین ہے، بے مثال ہے۔ اوپیرا میں جہاں آرا کا کردار بہت مضبوط دکھایا گیا ہے۔ بلند اختر کو زہر کا پان دیا گیا تو وہ برداشت نہیں کر پاتی:

جہاں آرا:

ہے یہ محل! کہ زنداں! زنجیر ہر قدم پر
دشمن کو بھی نہ دینا شہزادی کا مقدر

جہاں آرا:

سرِ دربار گری یہ بجلی
مغلیہ آن کے کاشانے پر
ہم سمجھتے ہیں کہ یہ موت بلند اختر کی،
زندگی سے بھی حسیں تر ہے، مگر
اس کا اعلان ہے یہ،
مغلیہ شان ہے اب روبہ زوال
مغلیہ شان ہے اب روبہ زوال

بہت حسین شاہکار، لاثانی اور لازوال۔ ایک ایک اوپیرا پورا مقالہ لکھنے کے قابل۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے ادارے آگے بڑھیں اور یہ اوپیرا پھر اسٹیج کی زینت بنے۔

وقت کا رہوار اپنی رفتار سست نہیں کرتا، رکنے کا تو سوال ہی نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ وہ انسان جو وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتا رہتا ہے ایک موڑ پر آ کر کہہ اٹھتا ہے:

''اے وقت کے رہوار ذرا دھیرے چل''

مگر کہاں۔ ریل کا شدید حادثہ، کینسر، دل کا مرض اور آخر میں یہ سانس کا عارضہ، مگر قلم کی رفتار میں جمود نہیں آیا۔ ۳۰ر نومبر ۲۰۰۸ء کو رفعت سروش نے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہا۔ پیش ہے ۸ر نومبر ۲۰۰۸ء کو کہی ان کی نظم: ''معمول''

آج کا دن بھی کٹا
آج بھی شعلۂ امید بجھا را کھ ہوا
جھنجھناتا ہی رہا تارِ نفس
رات آئی ہے، مگر نیند تو کیا آئے گی
ہاں نئے خوابوں کی یورش ہوگی
خواب! جن کی کوئی تعبیر نہیں ملتی ہے

رفعت سروش کو روشن مستقبل کا یقین تھا، آنے والی نسلوں پر بھروسہ تھا۔

ایک نظم: ''میراث:''

رات ڈھلنے لگی
نیند آنے لگی
انگلیوں سے قلم چھوٹ جانے کو ہے
موت آواز دینے لگی ہے مجھے
کوئی ہے اس قلم کو جو گرنے نہ دے
اس امانت کو جو نسل آدم کی میراث ہے
مجھ سے لے کر نئی نسل کو سونپ دے

اور آخر کار ان کو نیند آ ہی گئی..... ابدی نیند!!

اچانک گردش خوں رک گئی موج نفس ٹھہری
سکوت مستقل نے سلب کر لی دل کی بے تابی
ہزاروں ان کہے افسانے لب پر جم گئے اس کے
ابد کی نیند بن کر رہ گئی پہروں کی بے خوابی

◆◆◆